گھر کے کسی کونے سے بیگم اسما جہانگیر کے چلّانے کی آوازیں کافی دیر سے آ رہی تھیں۔ وہ جانتے تھے وہ اتنی جلدی تھکنے والی نہیں البتہ خود ان کو اپنے روم، روم میں اترتی تھکن کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی کسی افسوس بھرے پچھتاوے کی دھند میں لپٹا ایک بہت مانوس، بہت پرانا اور جانا پہچانا احساس انہیں گھیرے میں لے رہا تھا۔

سامنے ٹیبل پر رکھی چائے میں سے بھاپ اٹھنا

بند ہو چکی تھی۔ انہوں نے کپ کی طرف ایک نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے برعکس اس کپ کے علاوہ لاؤنج میں موجود ہر چیز پر اُن کی نظریں ایک عجیب سے خالی پن کے ساتھ بھٹک رہی تھیں۔ ان بے چین پتلیوں کے پیچھے بتیس سال پرانے منظروں کی اڑتی دھول تھی۔ لحظہ بہ لحظہ منظر دھندلا رہا تھا اور چنگھاڑتی ہوئی اسما جہانگیر کی آواز اس منظر کو بار، بار صاف کر دیتی تھی۔

''اماں......اماں بہت اچھی ہے وہ۔ بہت خوش اخلاق، ملنسار۔'' ایک بار پھر پیش منظر دھندلا اور پس منظر زندہ ہونے لگا۔

''اچھا مجھے تو وہ اچھی اور ملنسار کے بجائے کچھ اور لگ رہی ہے۔'' اماں کی کاٹ دار اور طنزیہ باتوں سے تو ایک زمانہ عاجز تھا۔ وہ تو پھر عجز و انکسار کا مثالی نمونہ تھے۔

''اماں! کیوں کرتی ہیں ایسی باتیں۔'' بہت بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

''لو بس......جو گھر میں آئی نہیں اس کے قصیدے زبان پر پہلے چڑھ گئے اور اماں کی باتیں ابھی سے ایسی ویسی لگنے لگیں۔'' اماں کی پاٹ دار آواز ان کے لب کھلتے ہی آس پاس کے گھروں تک گونج جاتی تھی۔

''صاحب جی!'' ان کی ادھ کھلی آنکھوں میں مُردہ ہوتی بصارت ایک دم زندہ ہو گئی۔

''چائے ٹھنڈی ہو گئی دوسری لا دوں؟'' سامنے کُل وقتی ملازمہ کھڑی تھی، وہ چند لمحے اسے دیکھتے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ شعور کی سطح کو کسی نے بتیس سال پہلے کی گرہوں سے باندھ رکھا تھا۔ مکمل حواس جاگنے میں ذرا دیر لگی۔

اسما جہانگیر کی آواز بند ہو چکی تھی۔ گھر میں بولتا سناٹا بڑا غیر معمولی اور تکلیف دہ حد تک چبھن آمیز تھا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر خود پر پڑی ماضی کی گرد جھاڑی۔ عابدہ ابھی تک انتظار میں کھڑی تھی۔

''نہیں بس رہنے دو، تم جا کر سو جاؤ اب۔''

انہوں نے ہاتھ میں پکڑی عینک سامنے گلاس ٹاپ ٹیبل پر رکھ دی اور وہیں پیر پھیلا کر نیم دراز ہوتے ہوئے ماضی کی بھول بھلیوں میں اتر گئے۔ اب جانے کب تک انہیں بھٹکنا تھا۔

☆☆☆

اسما کو شکایت تھی کہ گھر میں ان کا اس طرح استقبال نہیں کیا گیا جس طرح ایک نئی نویلی دلہن کا کیا جانا چاہیے تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ اس گھر کی پہلی اور بڑی بہو تھی۔ جہانگیر سمجھتے تھے لیکن کچھ بول نہیں سکے۔

''تم جانتی ہو، اماں اور نگین اس رشتے کے لیے راضی نہیں تھیں۔ اب اتنی ناراضی تو دکھائیں گی ناں۔ چھوٹی بہنیں بھی ان کے کہنے میں ہیں تو......''

''تو آپ پہلے انہیں منا لیتے پھر شادی ہو جاتی۔'' اسما دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئیں کہ نئی نویلی دلہن کا حجاب مانع تھا۔ آنے والے دن ان کی زندگی میں تلخیوں کے کون سے نئے باب رقم کروانے والے تھے اس حقیقت سے بے خبر فی الحال انہیں جہانگیر کی محبت اور زندگی بھر کا ساتھ کسی نعمتِ خداوندی سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

جہانگیر......سے شادی سے پہلے تین سال وہ اپنے ایک کزن سے منسوب اور اس کی محبت میں بری طرف گرفتار رہی تھیں خاندان میں چپقلش کی بنا پر منگنی ٹوٹی اور ساتھ ان کا دل بھی۔

جہانگیر اسے نوکری کے پہلے دن سے پسند کرتے تھے۔ منگنی ختم ہونے کی خبر کے ساتھ ہی انہوں نے اسما کو اپنانے کی پُرخلوص کوششیں شروع کر دیں اور بالآخر کامیاب بھی ہوئے۔ اسما بھی شروع، شروع میں راضی نہیں تھیں مگر پھر جہانگیر کی محبت اور اصرار کے آگے مانتے ہی بنی۔

☆☆☆

اسما کی سسرال وہی روایتی سسرال تھی۔ تین بہنوں اور تین بھائیوں میں جہانگیر سب سے بڑے تھے سو خود بخود بھائیوں کی تعلیم اور بہنوں کی شادی کی ذمے داری بھی انہی کے سر پر آ گئی تھی۔ کچھ وہ زمانہ اتنا مہنگا بھی نہیں تھا اور کچھ تنخواہ اور نوکری معقول تھی اس لیے گزارہ چلتا رہا۔

گھر میں اماں اور ان کے بعد نگین کی حکومت چلتی تھی۔ اسما کے آنے کے بعد انہوں نے سب کام کاج پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اسما نے سب کا دل جیتنے کے لیے کچن کی ذمے داری اپنے سر لے لی۔

اماں کو اس کی نوکری پر سخت اعتراض تھا۔ وہ صبح اس کے نکلتے وقت گھر سے بن ٹھن کر نکلنے والی عورتوں کے متعلق اخلاق سے گری ہوئی باتیں بہت جلدی کرنے لگیں۔ انہوں نے چند دن بھی اس کے دلہناپے کا بھرم نہیں رکھا تھا۔

اسما سے شروع میں سب سننا اور برداشت کرنا بہت مشکل ہوا۔ ایک دو بار اس نے کچھ بولنے کی کوشش بھی کی۔ اماں نے صبح صبح وہ طوفان اٹھایا کہ اللہ کی پناہ۔

''دیکھا، دیکھا...... کھل گئے خوش اخلاقی کے تالے۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ ان نوکری پیشہ عورتوں کی زبانیں دو دھاری تلواریں ہوتی ہیں۔''

''اماں......!'' وہ حیرت سے انہیں تکنے لگی۔

''میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟''

''اسما!'' جہانگیر نے بڑھ کر اس کا ہاتھ دبایا۔ ''چلو دیر ہو رہی ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گھسٹتی چلی گئی۔

''میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ سب عورتیں برابر نہیں ہوتیں۔'' بائیک پر اس کے پیچھے وہ دلگرفتہ سی بیٹھی تھی۔ جہانگیر جانتا تھا۔ وہ زبان دراز ہے نہ بدتمیز مگر اپنی اماں کے آگے اس کی حمایت کر کے مزید طوفان کھڑا نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

زندگی نے کسی تیز رفتار ٹرین کی طرح معمول کی رفتار پکڑی تھی۔ صبح سے شام آفس میں ہوتی پھر واپسی پر دن بھر کے گندے برتنوں کا ڈھیر اور اپنا پھیلا ہوا گھر اس کا منتظر ہوتا۔

اس کی تھکن کئی گنا بڑھ جاتی۔ گھر آتے ہی کھانے کی تیاری میں لگنا پڑتا۔ دو ٹائم کا کھانا ایک ہی وقت تیار کر کے وہ صبح ناشتے کے لیے انڈوں کا آمیزہ تک ریڈی کر دیتی۔ رات کو سب گھر والوں کو چائے اور اماں کو نیم گرم دودھ دے کر کمرے میں جاتی تو جسم کا جوڑ، جوڑ فریاد کرتا۔ ایسے میں جہانگیر کی قربت کی خواہش اس کی اپنی ہوتی یا جہانگیر کی...... نیند سے بوجھل جڑتی پلکوں اور تھکے ماندے دماغ کے آگے بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔

جہانگیر کبھی تو خود بھی جلدی نیند کی آغوش میں چلے جاتے کبھی بے بسی سے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ تکتے اس کے مدہوش وجود میں اپنی محبت کی باقیات تلاش کرتے اور اکثر ناکام رہے۔

☆☆☆

''تم لوگ بچوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے اسما؟'' قدرے سکون کے دن تھے۔ نگین کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہوئے ابھی چند دن گزرے تھے۔

''کیا کریں گے سوچ کر بھی۔ اپنی تھکن میں اضافہ۔'' اس نے مایوسی سے کہتے ہوئے اپنی ہمدرد دوست کو دیکھا۔

''یہ کیا بات ہوئی، بچوں کی خواہش کس کو نہیں ہوتی اور بچے ہوں گے تو لائف میں بڑا چینج آئے گا یار۔''

''میری لائف میں کوئی بھی چینج منفی تو ہو سکتا ہے مثبت نہیں۔'' سوچیں بہت تیزی سے مایوسی کے رنگ میں رنگ رہی تھیں۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو اور کیوں کہہ رہی ہو؟''

نازش شاید اس سے بحث کے موڈ میں تھی۔ اس نے بیزاری سے آنکھیں موند لیں۔

بند ہو چکی تھی۔ انہوں نے کپ کی طرف ایک نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے برعکس اس کپ کے علاوہ لاؤنج میں موجود ہر چیز پر اُن کی نظریں ایک عجیب سے خالی پن کے ساتھ بھٹک رہی تھیں۔ ان بے چین پتلیوں کے پیچھے بتیس سال پرانے منظروں کی اڑتی دھول تھی۔ لحظہ بہ لحظہ منظر دھندلا رہا تھا اور چنگھاڑتی ہوئی اسما جہانگیر کی آواز اس منظر کو بار، بار صاف کر دیتی تھی۔

''اماں......اماں بہت اچھی ہے وہ۔ بہت خوش اخلاق، ملنسار۔'' ایک بار پھر پیش منظر دھندلا اور پس منظر زندہ ہونے لگا۔

''اچھا! مجھے تو وہ اچھی اور ملنسار کے بجائے کچھ اور لگ رہی ہے۔'' اماں کی کاٹ دار اور طنزیہ باتوں سے تو ایک زمانہ عاجز تھا۔ وہ تو پھر عجز و انکسار کا مثالی نمونہ تھے۔

''اماں! کیوں کرتی ہیں ایسی باتیں۔'' بہت بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

''لو بس......جو گھر میں آئی نہیں اس کے قصیدے زبان پر پہلے چڑھ گئے اور اماں کی باتیں ابھی سے ایسی ویسی لگنے لگیں۔'' اماں کی پاٹ دار آواز ان کے لب کھلتے ہی آس پاس کے گھروں تک گونج جاتی تھی۔

''صاحب جی!'' ان کی ادھ کھلی آنکھوں میں مُردہ ہوتی بصارت ایک دم زندہ ہو گئی۔

''چائے ٹھنڈی ہوگئی دوسری لا دوں؟'' سامنے کُل وقتی ملازمہ کھڑی تھی، وہ چند لمحے اسے دیکھتے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ شعور کی سطح کو کسی نے بتیس سال پہلے کی گرہوں سے باندھ رکھا تھا۔ مکمل حواس جاگنے میں ذرا دیر لگی۔

اسما جہانگیر کی آواز بند ہو چکی تھی۔ گھر میں بولتا سناٹا بڑا غیر معمولی اور تکلیف دہ حد تک چبھن آمیز تھا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر خود پر پڑی ماضی کی گرد جھاڑی۔ عابدہ ابھی تک انتظار میں کھڑی تھی۔

''نہیں بس رہنے دو، تم جا کر سو جاؤ اب۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی عینک سامنے گلاس ٹاپ ٹیبل پر رکھ دی اور وہیں پیر پھیلا کر نیم دراز ہوتے ہوئے ماضی کی بھول بھلیوں میں اتر گئے۔ اب جانے کب تک انہیں بھٹکنا تھا۔

☆☆☆

اسما کو شکایت تھی کہ گھر میں ان کا اس طرح استقبال نہیں کیا گیا جس طرح ایک نئی نویلی دلہن کا کیا جانا چاہیے تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ اس گھر کی پہلی اور بڑی بہو تھی۔ جہانگیر سمجھتے تھے لیکن کچھ بول نہیں سکے۔

''تم جانتی ہو، اماں اور نگین اس رشتے کے لیے راضی نہیں تھیں۔ اب اتنی ناراضی تو دکھائیں گی ناں۔ چھوٹی بہنیں بھی ان کے کہنے میں ہیں تو......''

''تو آپ پہلے انہیں منا لیتے پھر شادی ہو جاتی۔'' اسما دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئیں کہ نئی نویلی دلہن کا حجاب مانع تھا۔ آنے والے دن ان کی زندگی میں تلخیوں کے کون سے نئے باب رقم کروانے والے تھے اس حقیقت سے بے خبر فی الحال انہیں جہانگیر کی محبت اور زندگی بھر کا ساتھ کسی نعمتِ خداوندی سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

جہانگیر......سے شادی سے پہلے تین سال وہ اپنے ایک کزن سے منسوب اور اس کی محبت میں بری طرف گرفتار رہی تھیں خاندان میں چپقلش کی بنا پر منگنی ٹوٹی اور ساتھ ان کا دل بھی۔

جہانگیر اسے نوکری کے پہلے دن سے پسند کرتے تھے۔ منگنی ختم ہونے کی خبر کے ساتھ ہی انہوں نے اسما کو اپنانے کی پُرخلوص کوششیں شروع کر دیں اور بالآخر کامیاب بھی ہوئے۔ اسما بھی شروع، شروع میں راضی نہیں تھیں مگر پھر جہانگیر کی محبت اور اصرار کے آگے مانتے ہی بنی۔

☆☆☆

اسما کی سسرال وہی روایتی سسرال تھی۔ تین بہنوں اور تین بھائیوں میں جہانگیر سب سے بڑے تھے سو خود بخود بھائیوں کی تعلیم اور بہنوں کی شادی کی ذمے داری بھی انہی کے سر پر آ گئی تھی۔ کچھ وہ زمانہ اتنا مہنگا بھی نہیں تھا اور کچھ تنخواہ اور نوکری معقول تھی اس لیے گزارہ چلتا رہا۔

گھر میں اماں اور ان کے بعد نگین کی حکومت چلتی تھی۔ اسما کے آنے کے بعد انہوں نے سب کام کاج پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اسما نے سب کا دل جیتنے کے لیے کچن کی ذمے داری اپنے سر لے لی۔

اماں کو اس کی نوکری پر سخت اعتراض تھا۔ وہ صبح اس کے نکلتے وقت گھر سے بن ٹھن کر نکلنے والی عورتوں کے متعلق اخلاق سے گری ہوئی باتیں بہت جلدی کرنے لگیں۔ انہوں نے چند دن بھی اس کے دلہناپے کا بھرم نہیں رکھا تھا۔

اسما سے شروع میں سب سننا اور برداشت کرنا بہت مشکل ہوا۔ ایک دو بار اس نے کچھ بولنے کی کوشش بھی کی۔ اماں نے صبح صبح وہ طوفان اٹھایا کہ اللہ کی پناہ۔

”دیکھا، دیکھا...... کھل گئے خوش اخلاقی کے تالے۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ ان نوکری پیشہ عورتوں کی زبانیں دو دھاری تلواریں ہوتی ہیں۔“

”اماں......!“ وہ حیرت سے انہیں تکنے لگی۔

”میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟“

”اسما!“ جہانگیر نے بڑھ کر اس کا ہاتھ دبایا۔ ”چلو دیر ہو رہی ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گھسٹتی چلی گئی۔

”میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ سب عورتیں برابر نہیں ہوتیں۔“ بائیک پر اس کے پیچھے وہ دلگرفتہ سی بیٹھی تھی۔ جہانگیر جانتا تھا۔ وہ زبان دراز ہے نہ بدتمیز مگر اپنی اماں کے آگے اس کی حمایت کر کے مزید طوفان کھڑا نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

زندگی نے کسی تیز رفتار ٹرین کی طرح معمول کی رفتار پکڑی تھی۔ صبح سے شام آفس میں ہوتی پھر واپسی پر دن بھر کے گندے برتنوں کا ڈھیر اور اپنا پھیلا ہوا گھر اس کا منتظر ہوتا۔

اس کی تھکن کئی گنا بڑھ جاتی۔ گھر آتے ہی کھانے کی تیاری میں لگنا پڑتا۔ دو ٹائم کا کھانا ایک ہی وقت تیار کر کے وہ صبح ناشتے کے لیے انڈوں کا آمیزہ تک ریڈی کر دیتی۔ رات کو سب گھر والوں کو چائے اور اماں کو نیم گرم دودھ دے کر کمرے میں جاتی تو جسم کا جوڑ، جوڑ فریاد کرتا۔ ایسے میں جہانگیر کی قربت کی خواہش اس کی اپنی ہوتی یا جہانگیر کی...... نیند سے بوجھل جڑتی پلکوں اور تھکے ماندے دماغ کے آگے بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔

جہانگیر بھی تو خود بھی جلدی نیند کی آغوش میں چلے جاتے کبھی بے بسی سے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ تکتے اس کے مدہوش وجود میں اپنی محبت کی باقیات تلاش کرتے اور اکثر ناکام رہے۔

☆☆☆

”تم لوگ بچوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے اسما؟“ قدرے سکون کے دن تھے۔ نگین کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہوئے ابھی چند دن گزرے تھے۔

”کیا کریں گے سوچ کر بھی۔ اپنی تھکن میں اضافہ۔“ اس نے مایوسی سے کہتے ہوئے اپنی ہمدرد دوست کو دیکھا۔

”یہ کیا بات ہوئی، بچوں کی خواہش کس کو نہیں ہوتی اور بچے ہوں گے تو لائف میں بڑا چینج آئے گا یار۔“

”میری لائف میں کوئی بھی چینج منفی تو ہو سکتا ہے مثبت نہیں۔“ سوچیں بہت تیزی سے مایوسی کے رنگ میں رنگ رہی تھیں۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو اور کیوں کہہ رہی ہو؟“ نازش شاید اس سے بحث کے موڈ میں تھی۔ اس نے بیزاری سے آنکھیں موند لیں۔

اب وہ نازش کو کیا بتاتی۔ اس کی ساس نوکری کرنے پر جتنی مرضی تنقید کریں' اس کا نوکری چھوڑنا ہرگز برداشت نہیں کریں گی۔ ابھی انہیں دو بیٹیاں اور بیاہنی تھیں اور دو بیٹوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا تھا۔ جو دنیا میں پہلے سے موجود ہیں ان کے جھمیلوں سے نمٹنے کے لیے اسما کی جان کم پڑ رہی ہے۔ مزید کسی اور کو دنیا میں لانے کی ہمت وہ کہاں سے لائے۔

کبھی کبھی اسے لگتا قسمت نے اسے کسی کولہو سے جوڑ دیا ہے۔ اپنی آنکھوں پر اندھی پٹی چڑھائے اسے اس کے گرد گھومنا ہے زندگی بھر۔ صبح سے رات تک کی انتھک قیدِ بامشقت میں اولاد جیسی نرم و نازک احساسات سے جڑی خواہش کا وقت ہی کہاں نکلتا تھا لیکن قسمت کو شاید کچھ اور منظور تھا۔

☆☆☆

جہانگیر چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا اور وہ اس کے چہرے کے پل، پل بدلتے رنگ دیکھتی رہی۔ ان رنگوں میں کوئی رنگ خوشی کا نہ تھا۔

''کیا ہوا؟''

''تمہیں احتیاط کرنی چاہیے تھی۔'' بالآخر امیدوں پر جلتا پانی پڑا۔

''اب تو ......ہو گیا ناں۔'' دل میں خوشی کا احساس کسی ڈرے سہمے بچے کی طرح کسی کونے میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا اب تو......؟'' انہیں سخت اعتراض تھا۔ ''ایسے کہہ رہی ہو جیسے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''تو......آپ کیا کرنے کا سوچ رہے ہیں؟''

اس کی سرسراتی آواز میں آگہی کا کرب تھا۔ وہ جانتی تھی جہانگیر مجبور ہے مگر بعد میں اسے وہم گزرا شاید وہ بے حس بھی ہے۔

تین دن دو راتیں اسپتال کے خنک کمرے میں وہ اکیلی رہی بہن کے گلے لگ کر سسکیاں لیتی رہی۔ اماں صرف اسے لے جانے کے لیے آئیں اور راستے میں کئی بار سر سے بلاٹل جانے پر شکر ادا کیا۔ بہ آواز بلند یوں آہیں بھرتی رہیں جیسے نادانستگی میں سب کچھ سرزد ہو گیا۔

''شکر تھا کہ میں نے جہانگیر کو بتانے میں دیر نہ کی ورنہ شاید جان سے جاتی۔'' دن رات کے سلگتے پہروں میں اس نے سنگدلی کی انتہا کرتے ہوئے یہاں تک سوچ ڈالا اور کرتی بھی کیا۔

☆☆☆

نگین کے بیٹے کی ولادت اور مہرین کی شادی...... دو خرچے ایک ساتھ نکلے اور اس کی تین سال سے ڈالی گئی کمیٹی کی رقم پھُر ہو گئی۔

''کب تک چلے گا اس طرح؟'' وہ زندگی میں پہلی بار جہانگیر سے لڑ پڑی۔

''خرچ تو زندگی کے ساتھ ہی چلتے ہیں اسمی۔'' جہانگیر کی آواز پست تھی۔

''تو میری بھی کوئی زندگی ہے۔ کوئی خواب، خواہش، ارمان ہے کہ نہیں۔ کیا، کیا نہیں سوچا تھا میں نے۔ میری بہن بن بیاہی کنواری بیٹھی ہے۔ اس کے لیے بھی مجھے ہی کرنا ہے۔ میرا تو کوئی بھائی بھی نہیں۔ آخر آپ کو نظر کیوں نہیں آتا اور اگر نظر آتا ہے تو بولتے کیوں نہیں؟'' اس نے پلٹ کر دیکھا جہانگیر نیند کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ بے بسی سی بے بسی تھی۔ اس نے سخت جھلا کر کانچ کے گلاس پر ہاتھ مارا چھناکے کی زوردار آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھے پھر معاملہ سمجھ کر اسے گھورا۔

''آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اور بھی بہت کچھ کہتے رہے وہ دیکھتی، سنتی رہی پھر ان کے کروٹ بدلنے پر پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی۔

☆☆☆

''زندگی سمجھوتوں سے عبارت ہے۔'' اس نے پوری زندگی میں، زندگی کا جتنا بھی فلسفہ سنا تھا صرف

اسی پر اعتبار آ گیا تھا......

''زندگی ایک سفر مسلسل ہے۔ جس کی منزل یا تو موت ہے یا لا حاصل تھکن۔'' اس نے اعصاب کو پُرسکون کرنے کے لیے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''ہر مہینے پابندی سے مساج لیا کریں۔ آپ کی اسکن بہت رف اور ڈل ہو رہی ہے۔''

''یہاں تو پوری حیاتی رف اور ڈل ہو گئی...... صرف اسکن ؟''

اعصاب پُرسکون کرنا اور ذہن کو سوچوں سے آزاد کرنا اتنا بھی آسان نہ تھا۔ باہر بائیک پر جہانگیر اس کے منتظر تھے۔ اس نے بیوٹی سیلون کے دروازے پر رک کر دور سے اسے دیکھا۔ سر جھکائے سوچوں میں گم ایک پژمردہ وجود، یہ وہ شخص نہیں تھا جس نے شادی سے پہلے اعتبار، اعتماد اور تحفظ بخشنے کے بلند و بانگ دعوے کیے تھے۔ یہ تو کوئی اور ہی وجود تھا۔ جس کی آنکھوں میں محبت کے نہیں بیزاری کے رنگ تھے اور جس کے اندر اپنے وعدے پورے کرنے کی سکت نہیں بچی تھی۔ جس کے دعوے منہ کے بل گر پڑے تھے۔

وہ چپ چاپ جا کر بائیک پر بیٹھ گئی۔ دائیں پہلو میں درد کی لہر اٹھی اور ذہن میں ایک دل دُکھاتا واقعہ پورے سیاق و سباق کے ساتھ تازہ ہو گیا۔

''یہ روٹیاں ہیں تمہاری شکل کی طرح کالی۔ یہ...... یہ سالن بنایا ہے پھیکا سیٹھا نہ روغن نہ ذائقہ۔'' انہوں نے چینی کی بھاری رکابی اٹھا کر دور پھینکی اور باورچی خانے سے نکلتی اسما بچتے، بچتے بھی اس کی زد میں آ گئی۔

''سی......ی۔'' صرف تصور سے ہی اس کی سسکاری نکل گئی۔

بائیک ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا گھر آ چکا تھا۔ ایک ایسا گھر جو خوشی، سکون اور تحفظ کے بجائے بے چینی، گھٹن اور دکھ کا مسکن تھا۔

ہاں اس دن اماں کے طعنے کا اثر ہوا تو صرف اتنا جہانگیر آفس سے اٹھا کر اسے فیشل کروانے اس پارلر لے آئے تھے۔ ماں کے کہنے پر ہی سہی شاید اسے احساس ہوا تھا کہ اسما کی کھلتی گندمی رنگت سنولا گئی ہے۔ مرے، مرے قدموں سے صحن پار کرتی اسما کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس احساس کے اچانک جاگ پڑنے پر روئے یا ہنسے۔

☆☆☆

ہمایوں کو نوکری ملی تو اس نے بھی اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنے کا شور مچا دیا۔

''میرا خیال تھا ہمایوں کی شادی میں اپنی عظمیٰ سے کروا دیتی۔'' اماں کے سامنے تو زبان کھولنے کی جرأت نہ تھی اور دکھ سکھ کہنے سننے والی اس کی مخلص دوست بیاہ کر دوسرے شہر جا چکی تھی۔ لے دے کر ایک جہانگیر بچے تھے حیران نظروں سے اسے تک رہے تھے۔

''دس سال اس گھر میں جھونک کر بھی تم اپنی بہن کو یہاں کھپانا چاہتی ہو؟''

''ہاں تو میں نے اس گھر کی اتنی خدمت کی ہے۔ آپ کے بہن بھائیوں کی، آپ کی ماں کی کتنی باتیں سنی ہیں۔ کڑوی کسیلی برداشت کی ہے اسی کے بدلے کی آس میں کہہ رہی ہوں اور میری بہن شکل صورت، تعلیم سگھڑاپا کسی چیز میں کسی سے کم تو نہیں۔''

مگر سب بیکار ہی گیا۔ جہانگیر جانتے تھے سمجھتے تھے۔ ہمایوں سے کچھ بھی کہنا بیکار ہوگا۔ اس کی زبان پر جہانگیر کی مثال تھی۔

''بھیا نے بھی تو کی تھی اپنی پسند کی شادی تو میں کیوں نہیں؟'' اسما سن کر چپ کر گئی۔ بول کر بات گنوانے سے خاموش رہنا بہتر ہوتا ہے۔ اس نے بھی ایک چپ والے مقولے پر عمل کیا۔

جہانگیر نے عظمیٰ کے لیے خود رشتہ ڈھونڈ کر اس کی شادی کروائی اور پوری زندگی میں یہ واحد چیز تھی جس کے لیے وہ صحیح معنوں میں ان کی شکر گزار تھی۔

تینوں نندیں اپنے گھر بار کی ہوئیں اور دیور ہاتھ بٹانے کے قابل ہوئے تب تک وقت بہت آگے نکل چکا تھا۔

''آئی ایم سوری۔'' اس کی آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔

ڈاکٹر کے لبوں سے نکلنے والا جملہ تیر کی طرح اس کے دل میں پیوست ہوگیا۔ اسے یوں لگا بھری دنیا میں وہ تن تنہا کھڑی رہ گئی۔ کسی نے اسے سر سے چادر کھینچ کر دھوپ بھری تپتی دوپہر میں دھکیل دیا ہے۔

رپورٹس اٹھاتے ہوئے جہانگیر کے ہاتھ کانپ گئے اور زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ جب وہ ہمیشہ کی طرح کھوکھلی تسلی کے چند سکے اس کے خالی دامن میں ڈال رہے تھے تو اس نے اپنا دامن سمیٹ لیا۔

''یہ سب تمہارا اور تمہارے گھر والوں کا قصور ہے۔'' وہ اتنی زور سے چلائی کہ حلق میں خراشیں سی پڑ گئیں۔

''کیوں کی تھی تم نے مجھ سے شادی؟ اس لیے...... اس لیے مجھے برباد کرنے کے لیے...... بولو کیا ملا تمہیں میری زندگی سے کھیل کر...... بولو؟'' اس نے جہانگیر کا گریبان تھام لیا اور جہانگیر نے دھندلائی آنکھوں سے اس کا وحشت بھرا چہرہ دیکھا۔

وہ چہرہ کیسا تھا۔ کسی لٹے پٹے مسافر کا چہرہ۔ کسی رہزن کو رہنما سمجھ کر دھوکے میں آجانے والے کا چہرہ۔ خوش قسمتی کی دیوی کے گمان میں چھل پیری کے تعاقب میں چل پڑنے والے کا چہرہ۔ جھلستے ریگستان میں سراب کے پیچھے بھاگنے والے کا چہرہ جو تھک کر تپتی ریت پر گرا آخری سانسیں گن رہا تھا۔

''ارے برباد تو میرا بیٹا ہوا ہے اولاد کو ترس گیا۔'' اماں نے ہر بار کی طرح بات کے درمیان میں آنے کی کوشش کی۔ وہ ہمیشہ یونہی کسی قسم کی جواب طلبی پر جہانگیر کی ڈھال بننے کے لیے گولہ باری کر کے اسما کو چپ کروا دیا کرتی تھیں لیکن آج شاید یہ سورج کہیں اور سے طلوع ہوا تھا۔

''آپ ہمارے ذاتی معاملے میں مت بولیں۔''

''ارے واہ...... کیوں نہ بولوں؟'' وہ تنک گئیں۔

''کیونکہ آپ کو کوئی حق نہیں ہے ہمارے کسی بھی معاملے میں بولنے کا اور اگر آپ کو بولنا ہی تھا تو اس وقت آپ کیوں چپ رہیں جب آپ کا بیٹا اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد ختم کر رہا تھا۔ تب آپ کو اپنی اولاد کی فکر تھی تب آپ کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ دنیا میں آنے والا وجود بھی آپ کی اولاد، آپ کا خون ہوگا اور اب بھی...... آج بھی آپ کو اپنے بیٹے کی بے اولادی کا غم ہے اور ایک عورت کے درد کا کوئی احساس نہیں۔ جس کا وجود آپ کے گھر کے مسائل نمٹاتے، نمٹاتے ادھورا رہ گیا۔ آپ کو اب بھی میرا نہیں اپنے بیٹے کا احساس ہے...... اور آپ کا بیٹا...... وہ بے حس ہے...... ہاں وہ بے حس اپنی بیوی کا دکھ کیا بانٹے گا جو اسے سمجھنے والا دل ہی نہیں رکھتا۔'' وہ بری طرح ہانپ گئی۔ اماں کان دبا کر کمرے میں گھس گئیں۔

اس کی دیورانی نے ٹھنڈے پانی کا گلاس لا کر اس کے لبوں سے لگایا اور اس کا سر سینے سے لگا کر تھپکنے لگی۔ اس عورت کو گھر میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر وہ اپنی جیٹھانی کی بے قدری کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد شوہر کو لے کر الگ ہونے کے منصوبے بنا رہی تھی۔

اسما کو فی الحال وہی کندھا میسر تھا سو وہ رشتوں کی ساری نزاکتوں کو بالائے طاق رکھ کر دیر تک سسکتی رہی۔ یوں لگتا تھا اگر آج بھی نہ روئی تو شدتِ ضبط سے پتھرا جائے گی۔

☆☆☆

چھوٹے دیور کو شادی کے بعد ساتھ رکھنے کے لیے اوپری منزل تعمیر کروائی گئی۔ جہانگیر کو آفس سے لون لینا پڑا مگر اس نے بھی ساتھ رہنا گوارا نہ کیا۔

''آپ کرایے دار رکھ لیں جہانگیر بھائی اماں کا آپ کو پتا ہے زبان کی کتنی کڑوی ہیں اور ماہا کا

مزاج ایسا نہیں کہ وہ ان کو زیادہ برداشت کرے۔ ''بڑے بھائیوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس نے بھی اپنے جیون ساتھی کا انتخاب خود کیا تھا۔ بہنوں کو کبھی کبھی بڑا قلق ہوتا کہ پسند کی شادی کے لطف سے وہ لوگ کیوں بہرہ مند نہ ہو سکیں اور بھائیوں نے گھر، گھر جا کر لڑکیاں دیکھنے اور مسترد کرنے کا کھیل بھی انہیں نہ کھیلنے دیا۔

ہر ہفتے وہ لوگ گھر میں جمع ہوتیں۔ بھاوجوں کی ہنسی اڑائی جاتی۔ بیٹیاں بالکل اماں کا پرتو تھیں۔ اتنے برس کی اسما کی خدمتوں کا یہ صلہ تھا کہ آج بھی اس گھر میں اس کی حیثیت ایک چلتی مشین سے زیادہ نہ تھی۔ جس کو توجہ صرف اسی وقت عنایت کی جاتی جب کام چلنا بند ہو جاتا۔

اب بھی وہ دو دن سے بخار میں تپتی آفس جا رہی تھی لیکن کسی کو خیال تک نہ آیا تھا لیکن آج آفس سے واپسی پر دیر ہو گئی تو سب کی زبانیں چل پڑیں۔

ہفتہ واری تعطیل پر نندیں جمع تھیں۔ کھانا پکانے کے لیے آج بھی اس کی محتاجی تھی۔ سو جی جان سے انتظار ہو رہا تھا لیکن دو گھنٹے گزر گئے اس کی آمد کے آثار نہ تھے۔ جہانگیر بھی ساتھ ہی آتے تھے آج وہ بھی غائب تھے۔ چارو ناچار نگین اور مہرین کو کچن میں لگنا پڑا۔

جس وقت انہوں نے گھر میں قدم رکھا۔ کھانا کھانے کے بعد دسترخوان سمیٹا جا رہا تھا جس گھر میں کبھی اس کے ہاتھ کے علاوہ کسی اور نے چولہا تک نہ جلایا تھا آج اسی گھر میں اس کا انتظار تو دور کی بات کسی نے فون کر کے خیریت تک نہ پوچھی۔ جہانگیر کو گھر کی چہل پہل چبھ سی گئی۔ جو خبر وہ ساتھ لائے تھے کسی کو بھلا یہاں اس کا انتظار بھی تھا؟

سب کو سلام کرتے وہ اسما کا ہاتھ پکڑ کر سیدھا کمرے میں لے گئے۔

''کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ نہ کل سے آفس جانے کی۔'' برسوں بعد اس کے لہجے میں وہی توجہ اور محبت بول رہی تھی جب اس کی منتظر سماعتیں بہری اور بصارتیں اندھی ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

جہانگیر نے خود شہر کی معروف اور جانی پہچانی گائنا کولوجسٹ سے اس کا علاج کروایا تھا۔ اس کی چاہت اور خدا سے دعاؤں کا نتیجہ سامنے آگیا تھا۔

ماں بننے کا عمل کتنا بھی تکلیف دہ سہی مگر وہ اکملیت عورت ذات کو عطا کر دیتا ہے۔ جس کی برابری اس جہان میں شاید دوسرا کوئی عمل نہ کر سکے۔ اس کے وجود میں بھی شانتی سی بھر گئی۔

جہانگیر اس کی نوکری کے خلاف تھے اور وہ جہانگیر کے اس فیصلے کے خلاف۔ وہ جان گئی تھی ریل کی پٹریاں اور سمندر کے کنارے کبھی نہ ملنے کے باوجود ساتھ چلتے ہیں اور اسی طرح اسے بھی چلنا تھا۔ ساری زندگی دوسروں کے لیے جان ماری تو اپنی اولاد کے لیے نہ کرتی؟

اس کے خواب زندہ ہو گئے تھے۔ خواہشیں جاگ گئیں۔ طنز و طعنے، تشنع، حیرت زدہ رویّے اور اٹھی ہوئی انگلیاں ساس کی زبان اور نندوں کے رویّے۔ بالکل کسی معجزے کے مانند اس کی زندگی میں آنے والے اس عطیۂ خداوندی نے پردہ تان دیا۔ ہر تکلیف دہ چیز اور ہر برا رویّہ پس منظر میں چلا گیا یہاں تک کہ خود جہانگیر بھی۔

وہ اپنی دنیا میں مگن اپنے آنے والے بچے کو خوش آمدید کہنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ خدا تعالیٰ سے اس ادھورے پن اور اس مشکل زندگی پر کیے گئے شکووؤں کو پسِ پشت ڈال کر سجدۂ شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔

اس نے آفس سے چھ مہینے کی چھٹی لی اور جب دوبارہ سے آفس جانا شروع کیا تو ایک کل وقتی آیا کو بچے کی نگہداشت کے لیے رکھ لیا۔

اماں تو جیسے اعتراض کا سگنل تھیں۔ اس بات

پر بھی کافی لے دے ہوئی لیکن اسماء کسی کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھی۔

☆☆☆

"کم بخت ماری...... منحوس...... چل دفع ہو یہاں سے۔" اماں نے دوسالہ ننھی صبوحی کے دو ہنٹر کمر پر جمائے اور بازو پکڑ کر کمرے سے باہر دھکیلا، دہلیز سے اندر آتی اسما کا دل یہ منظر دیکھ کر کٹ کر رہ گیا۔

"کتنی بار کہا ہے صبوحی کو ہر وقت نظروں کے سامنے رکھا کرو۔" وہ ملازمہ پر برس پڑی۔ ملازمہ اب اس کے آگے منمنا رہی تھی مگر وہ اس سے بے خبر حال سے بے حال اپنی بیٹی کا جائزہ لے رہی تھی۔

مٹی دھول اور گرد میں اٹے رات والے کپڑے، چپچپاتا ہوا منہ اور گندے سندے ہاتھ اسے اپنی بیٹی اور کسی لاوارث یتیم بچی میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔

"کن کاموں میں لگی تھیں تم جو صبح سے اسے اس حال میں چھوڑ رکھا ہے؟"

"جی وہ بڑی اماں جی نے......" عابدہ کو آج گلوخلاصی بہت مشکل لگ رہی تھی۔

"بھاڑ میں ڈال دو بڑی اماں جی کو۔" اماں تک آواز بخوبی پہنچ چکی تھی۔ وہ اور اپنے کمرے سے کپڑے بدل کر جہانگیر ایک ساتھ باہر آئے۔

"یہ میرا گھر ہے کسی کی ہمت ہے جو مجھے نکالے۔" اماں کی عمر نہیں تھی اب پہلے کی طرح ڈنکے کی چوٹ پر فساد کرنے کی مگر طرہ اور طنطنہ آج بھی ویسا ہی تھا۔

"میری...... میری ہمت ہے آپ کو یہاں سے نکالنے کی۔" اسما پر ایک جنون سا طاری ہو گیا۔ وہ بالکل اسی طرح اپنی ساس کو بازو سے گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گئی جیسے ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے اس کی بیٹی کو نکالا تھا۔ جہانگیر یہ منظر دیکھ کر ان کی طرف لپکے۔

"ہائیں، ارے چھوڑ مجھے۔" اماں کہتی رہ گئیں اور جب تک جہانگیر اس کے سر پر پہنچے اس نے اماں کو صحن کے وسط میں لے جا کر تقریباً جھٹک دیا۔ اماں کا سارا جسم جھٹکا کھا کر رہ گیا۔

جہانگیر نے یہ منظر دیکھ کر ہاتھ اٹھایا اور زوردار آواز کے ساتھ اسما کے رخسار پر نشان چھوڑ گیا۔ وہ پتھرا کر رہ گئی اور جہانگیر، اماں کو سنبھالتے اندر لے گئے۔

"ارے میرے اللہ! لے دیکھ لے جہانگیر تیری موجودگی میں تیری ماں کو گھر سے نکالنے کی دھمکیاں...... ارے میرے مولا! میں یہ وقت دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گئی۔" اماں کے واویلے جاری تھے۔

جہانگیر ان کی کیفیت کو خوب سمجھتے تھے۔ افسوس یہ تھا کہ انہیں آج بھی ماں سے ہمدردی تھی۔ بیوی سے اگر تھی بھی تو اتنی ہمت نہ تھی کہ جتا سکتے۔ بیوی کی دلی و دماغی کیفیت کا اندازہ تھا بھی تو اس کا اظہار کرنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ دیر تک ماں کو تسلی دے کر باہر نکلے تو باہر اسما تھی نہ صبوحی۔

☆☆☆

پوری رات جیسے سلگتے انگاروں پر چلتے گزری۔ صبوحی اور اسما کا کہیں پتا نہ تھا۔ انہوں نے تمام دوستوں اور جاننے والوں سے آنے بہانے معلوم کر لیا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ بوکھلا کر اماں کو بتانے آئے تو پتا چلا وہ تو کب کی کھانے سے فارغ ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر سو چکی ہیں۔

چند گھنٹے پہلے ان سے ہمدردی جتاتے بیٹے کو اب ان کی بے رخی اور اپنی بیوی کی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا پھر ہر گزرتے پل کے ساتھ یہ احساس دوچند ہوتا گیا۔ جلتی آنکھوں اور سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ دوسرے دن صبح آفس پہنچا مگر اسما نہیں آئی تھی۔ ہاں اس کی طرف سے چھٹی کی درخواست ضرور آ گئی تھی۔

وہ چور نگاہوں سے ایک، ایک کا چہرہ کھوجتا رہا مگر سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ بات ایسی تھی کہ

زیادہ دن چھپ نہ سکی اور پورے خاندان میں اسما کے چلے جانے کی خبر نشر ہوگئی۔ جس نے بھی سنا دانتوں میں انگلیاں داب لیں۔ بہنیں تو جل کر خاک ہوگئیں اور بھائی کے سر ہوگئیں کہ فوراً طلاق کے دو حرف بھیج کر گلو خلاصی کرلو۔ نہ آگئی عقل ٹھکانے تو پھر کہنا لیکن اب جہانگیر کو عقل آچکی تھی۔

وہی بہنیں تھیں جو اسما کی موجودگی میں ہر ہفتے دس، پندرہ دن بعد رہنے آتیں، دعوتیں اڑاتیں۔ اسما کے بنائے کھانوں میں مین میخ نکالتیں ایک ہی ہفتہ گزرا تھا اور وہی بہنیں اپنے، اپنے گھروں کو بہانے بناتی لوٹ گئیں۔ دو دن سے زیادہ نہ ٹک سکیں۔ کام کی زیادتی سے گھبرا گئیں۔

دیورانیوں سے تو کوئی امید ہی نہ تھی۔ لے دے کر وہی ملازمہ جو صبوحی کی دیکھ بھال پر مامور تھی۔ اب گھر کی دیکھ ریکھ سنبھالنے لگی۔ اچھا بھلا چلتا ہوا گھر الٹ پلٹ ہوگیا اور جہانگیر کو سب کی اصلیت اور اسما کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا۔

وہ دیوانوں کی طرح جگہ، جگہ اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اسے ہر قیمت پر اسما کو واپس لانا تھا اس کے لیے وہ اس کے پیروں تک میں پڑنے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆

آنسو ٹپاٹپ آنکھوں سے نکلتے گود میں رکھے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ باہر سے جہانگیر کے گڑگڑانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ اس کی کولیگ اور دوست فرزانہ کے آگے بیٹھا ہوا تھا۔

آج اسما چھٹیوں کے بعد پہلے دن آفس گئی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ جہانگیر سے بس اتنے ہی دن چھپ سکتی ہے۔ واپسی میں اس کے اندازے کے عین مطابق وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے فرزانہ اتنے دن اس سے جھوٹ بولتی رہی کہ اسے اسما کی موجودہ رہائش کا علم نہیں۔

''خدا کے لیے، دیکھیں آپ نہیں جانتیں، میں کتنی مشکل میں ہوں پلیز اسے بلائیں۔''

''میں جانتی ہوں بلکہ اچھی طرح آپ کی مشکل سمجھتی ہوں۔ گھر کی کل وقتی ملازمہ اچانک ملازمت چھوڑ جائے تو گھر والوں کو کپڑے، برتن اور کھانے کی مشکل ہوجاتی ہے۔'' فرزانہ تپی بیٹھی تھی۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں، دیکھیں پلیز میری ایک بار اس سے بات کروادیں۔ میں نہیں رہ سکتا یوں اس کے بغیر۔'' اس کے کانوں میں اس کی آواز آرہی تھی اس کی آہ نکل گئی۔

''وہ نہیں سمجھتی یہ بات کہ وہ میرے لیے کیا ہے لیکن میں جانتا ہوں میرے لیے تو زندگی کا تصور محال ہے۔ میں اس کے اور اپنی بیٹی کے بغیر نہیں جی سکتا۔ اگر وہ نہیں ملی مجھے تو میں کچھ کر بیٹھوں گا۔'' اس

کی آواز رندھ گئی۔
اسما کے کانوں میں کسی نے امرت جل ٹپکایا اور وہ پھر سے جی اٹھی۔ اس کی برداشت کی حد یہیں تک تھی۔ وہ بے اختیار اٹھ کر دروازے تک آ گئی۔
''میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں لیکن ایک شرط پر۔''
''اسما! تم..... کیسی ہو تم؟'' وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے منظور ہے تمہاری ہر شرط۔''
''میں آپ کی ماں کے ساتھ نہیں رہوں گی۔''
جہانگیر نے اس کی سرخ آنکھوں میں جھانک کر سر جھکا لیا۔
''ٹھیک ہے۔''

☆☆☆

زندگی کے باقی ماندہ سال اسما کی ہمراہی میں گزرے تو مگر ویسے نہیں جیسے انہوں نے سوچا تھا۔
اسما کے دل سے جہانگیر اتر چکے تھے۔ سالہا سال گزرنے اور اولاد کے جوان ہونے کے بعد بھی وہ اسما کے دل میں ویسی جگہ نہیں پا سکے۔ اماں جی اس دنیا سے چلی گئیں۔
دوسرا گھر لے کر اسما کو الگ رکھنے پر تمام بہن بھائیوں میں اماں کی رہائش کا جو مسئلہ کھڑا رہتا تھا وہ یوں اختتام پزیر ہوا کہ گھر بکا اور سب کو ان کا حصہ مل گیا۔ یوں اسما کا ایک طرح سے اس گھر اور گھر والوں سے ہر وقت کا تعلق اور سامنا ختم ہو گیا۔
اور یہ...... یہ گھر جہاں کا ذرہ ذرہ اسما اور خود جہانگیر کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا یہ گھر نارسائی، دوری کے کتنے ان گنت تنہا لمحوں کا امین تھا۔
اسما کے دل میں گھر کر لینے والے فاصلے اور لہجے میں بس جانے والی اجنبیت کو وہ چاہ کر بھی ختم نہیں کر سکے۔ اماں نے کسی لحاظ سے اسما کا دل دکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اسے اس کی شادی سے پہلے ٹوٹنے والی منگنی اور منگیتر کی یاد تک کا طعنہ بنا کر بنا کسی لاگ لپیٹ کے اس کے منہ پر دے مارا تھا۔
سسرال میں گزارنے والی غلامانہ زندگی اور گھٹن زدہ ماحول نے اسما کے مزاج میں عجیب سی حاکمیت بھر دی تھی۔ انہوں نے صبوحی کی زندگی کا ہر فیصلہ خود کیا تھا اور جہانگیر سے صلاح مشورہ تو دور کی بات ان کے استفسار کے بغیر بتانے تک کی زحمت نہ کی تھی۔ صبوحی سمجھدار ہو چکی تھی۔ وہ ماں اور باپ کے درمیان موجود حد درجہ خاموشی کو صرف ذہنی ہم آہنگی کی کمی قرار دیتی تھی۔ پس پردہ محرکات کے بارے میں اسے دلچسپی تو تھی لیکن ماں باپ سے پوچھتے ڈر لگتا تھا۔
وہ کیا سمجھتی ہے کیا نہیں اسما کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا اور جہانگیر میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اسے ماضی کے بارے میں کچھ بتا سکیں گزرتے وقت نے جہاں جہانگیر کے اعصاب شکستہ کر دیے تھے وہیں گھر کے در و دیوار کو ایک سکون اور بھید بھری خاموشی بخشی تھی۔
آج یہ خاموشی بری طرح چکنا چور ہو گئی تھی۔
جہانگیر کی بہن نگین نے اپنے بیٹے کے لیے صبوحی کا ہاتھ مانگا تھا اور اسما کو کسی نے یہ بھنک دے دی تھی کہ جہانگیر اپنی بہن کو صبوحی کے رشتے کے لیے ہاں کر آئے ہیں۔
''اللہ اکبر!'' فضاؤں میں گونجتی صدائیں پُرنور بلاوا دے رہی تھیں۔ ''نماز نیند سے بہتر ہے۔'' بے شک نیند جو غفلت میں ڈال دیتی ہے اور نماز جو ہر مصیبت سے چھٹکارے کا حل ہے۔ ''آؤ فلاح کی طرف۔'' بلاوا مل رہا تھا۔
بلاؤں کو ٹالنے کا بلاوا، مصیبتوں سے چھٹکارے کا بلاوا، راز و نیاز کے لیے بہترین ہمراز کا بلاوا۔ وہ دونوں جہانوں کے مالک کا بلاوا۔
''آؤ میرے پاس آؤ۔ مجھ سے کہو، میں سننے والا ہوں، مجھ سے مانگو، میں دینے والا ہوں۔''

جہانگیر احمد اطراف سے بے نیاز سجدے میں زاروقطار رو رہے تھے۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر ملازمہ عابدہ مکینوں کی منتظر تھی لیکن فی الوقت کوئی بھی نہ جاگا تھا۔ بیگم اسما جہانگیر عرصہ ہوا نوکری چھوڑ چکی تھیں اور آج جہانگیر کا بھی آفس جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی نوکری سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ ریٹائرمنٹ سے ملنے والی رقم اور مکان کے حصے سے کاروبار کرلیا۔ کاروبار نے دھیرے، دھیرے کافی ترقی کرلی تھی۔ خدا نے اس سلسلے میں انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ گھر کے حالات میں بہتری آتے ہی انہوں نے اسما سے نوکری چھوڑ کر آرام کرنے کی استدعا کی تھی۔ حکم دینے کے قابل وہ خود کو نہیں سمجھتے تھے اور مشورے کے قابل اسما نے انہیں سمجھنا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ خود بھی گھر اور حالات کے گھن چکر میں ٹھیک ٹھاک پس چکی تھیں لہٰذا استعفیٰ دینا ہی مناسب سمجھا۔

''باجی ناشتا کمرے میں ہی کریں گی۔ ٹرے لگا دو میں لے جاؤں گا۔''

''جی!'' اس انوکھی بات پر عابدہ کا منہ کھل گیا مگر جہانگیر کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھتے ہوئے وہ کچھ نہیں بول سکی۔

اسما اٹھ چکی تھیں واش روم سے نکلتے ہوئے انہوں نے جہانگیر کو ناشتے کی ٹرے اٹھا کر کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹک سی گئیں۔

''اونہہ..... اب یہ ہتھکنڈے، گھسے پٹے مجھے منانے کے لیے استعمال کیے جائیں گے۔'' دل ہی دل میں سوچتی وہ ڈریسنگ کی طرف مڑ گئیں۔ بدگمانیوں کے جال میں ان کا دل جکڑا ہوا تھا اور جہانگیر کا معذرت خواہانہ رویہ اتنے برسوں میں اس جال کی ایک بھی گرہ کو کتر نہ سکا تھا۔

''تم نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا اسی!

## ادبی لطائف

### جگر مراد آبادی

مشاعرے میں ایک مسلم الثبوت استاد نے ایک طرح مصرعہ دیا...... باغ سے آرہی ہے بوئے کباب
سبھی شاعروں نے طبع آزمائی کی لیکن کوئی گرہ نہ لگا سکا۔ ان میں سے ایک شاعر صاحب ہر صبح دریا کے کنارے نکل جاتے اور اونچی آواز سے الاپتے...... باغ سے آرہی ہے بوئے کباب......

ایک روز ادھر سے ایک کم سن لڑکا گزرا، جونہی شاعر نے یہ مصرعہ پڑھا، وہ لڑکا بول اٹھا۔

کسی بلبل کا دل جلا ہوگا

یہی لڑکا بڑا ہو کر جگر مراد آبادی کے نام سے مشہور ہوا۔

### جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے لیے ان کی کوٹھی پر پہنچے...... وہاں ملاقاتیوں کا ایک جم غفیر پہلے سے موجود تھا۔ کافی دیر تک انتظار کے بعد بھی جب ملاقات کے لیے جوش صاحب کی باری نہ آئی تو انہوں نے اکتا کر ایک چٹ پر یہ شعر لکھ کر چپراسی کے ہاتھ مولانا کی خدمت میں بھجوایا۔

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

مولانا شعر پڑھ کر مسکرائے اور فوراً جوش صاحب کو اندر بلالیا۔

☆☆☆

عبدالحمید عدم کا کسی صاحب نے جوش سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''آپ عدم ہیں......''

عدم کافی تن و توش کے آدمی تھے۔ جوش نے ان کے ڈیل ڈول کو بغور دیکھا اور کہنے لگے'' عدم یہ ہے تو وجود کیا ہوگا؟''

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

پلیز ناشتا کرلو۔ تم جس بات پر ناراض ہو ویسا کچھ نہیں ہے۔ درحقیقت میں نگین کو انکار کہنے کے لیے گیا تھا کیونکہ مجھے اپنی بیٹی کے لیے بھانجے سے کہیں بہتر رشتہ مل سکتا ہے۔"

اسما کے ہاتھ ساکت ہو گئے انہوں نے بے ساختہ مڑ کر انہیں دیکھا۔

"ایک باپ ہونے کے ناتے میں نے کبھی صبوحی پر اپنا حق نہیں جتایا لیکن اتنا تو میں کر ہی سکتا ہوں ناں۔ مجھے امید ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

وہ اسما کی طرف پشت کر کے بیڈ پر بیٹھے تھے۔ بات کے اختتام پر ذرا کی ذرا مڑ کر اسما کو دیکھا تو وہ حیرت سے ان ہی کو دیکھ رہی تھی۔

"لیکن میری ایک بات کا جواب دے دو۔ میں مانتا ہوں کہ ساری زندگی میری ماں اور گھر والوں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی۔ تمہیں اس گھر میں نہ وہ جگہ ملی نہ عزت جو تمہارا حق تھی لیکن بدلے میں تم اتنے سالوں سے مجھے ذلت، تحقیر اور بے گانگی لوٹاتی رہی ہو۔ جو میرے گھر والوں نے تمہارے دامن میں ڈالی تھی۔ اماں پر میرا زور نہیں چل سکا لیکن میں نے اپنے طور پر کبھی حقیر نظروں سے تمہیں نہیں دیکھا۔ تمہارے کردار کی طرف انگلی نہیں اٹھائی۔ تمہارے ساتھ جو کچھ برا ہوا میرے گھر والوں کی طرف سے ہوا۔ ان سے ملنے والی ساری تلخی تم نے اپنے اور میرے رشتے میں گھول دی۔ تمہیں اولاد مل گئی، یہ گھر مل گیا اور کھوئی ہوئی عزت بھی جس کا ثبوت میری بہن کی طرف سے دیا جانے والا رشتہ ہے لیکن......" گہری سانس بھر کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسما حیرت کی زیادتی سے گنگ سی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"سودوزیاں کے اس تمام حساب کتاب میں میرے حصے میں کیا آیا...... صرف طعنے تشنع اور الزامات...... ایک ہاں صرف ایک رشتہ بنانے اور نبھانے میں، میں نے پوری زندگی لگا دی۔ مجھے اس رشتے نے کیا دیا؟ تمہیں اس کا جواب ملے تو مجھے ضرور دینا۔" وہ پژمردہ قدموں سے بات مکمل کر کے باہر نکل گئے۔ اسما کے ہاتھ سے لوشن کی بوتل چھوٹ کر قالین پر جا گری۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی پھر بھی وہ جانتی تھیں کہ جہانگیر جاگ رہے ہوں گے۔ گو کہ بہت عرصہ ہوا انہوں نے بالخصوص رات کی نیند کے لیے بیڈروم میں آنا ترک کر دیا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ... ٹی وی دیکھتے یا کوئی کتاب پڑھتے ہوئے، کبھی اسٹڈی روم یا کبھی ڈرائنگ روم میں ہی سو جاتے تھے۔

اسما نے کبھی اس بات کو درخورِ اعتنا نہ جانا تھا کہ جہانگیر کو اسما کی توجہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے یا نہیں۔

"میرے نزدیک جذبات صرف میں رکھتی تھی۔ دل صرف میرا ٹوٹا تھا۔ ارمان صرف میرے خون ہوئے اور محبت اور توجہ کی ضرورت صرف مجھے تھی۔ میں نے جہانگیر کو از خود ہی ان تمام فطری تقاضوں سے مبرا کر دیا۔" جہانگیر نے گزرے ماہ و سال میں کبھی نہیں جتایا لیکن ان کا صرف ایک ہی بار سوال کرنا۔ اسما کو کٹہرے میں کھڑا کر گیا۔

"میری سوچیں، ارادے اور منصوبہ بندیاں ہم سے سکڑ کر میں کے دائرے میں سمٹ گئیں پھر میں نے خود ہی اپنی مرضی سے اپنی بیٹی کو اس حاشیے میں کھینچ لیا۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ وہ صرف میری نہیں ہماری اولاد ہے۔ میری اور...... جہانگیر کی۔"

اعتراف اور خود احتسابی کے لمحے بہت کڑے تھے۔ وہ چند لمحوں میں پسینے میں بھیگ گئیں۔

"اوہ خدایا......" کمرے میں ٹہلتے ان کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ انہوں نے تھک کر بستر پر گرتے ہوئے اپنی کنپٹیاں دونوں ہاتھوں سے سہلائیں۔

"شاید...... شاید مجھے جہانگیر سے معافی مانگنی

چاہیے۔'' آنکھوں کے گوشوں سے دو قطرے نکل کر دائیں بائیں بہہ گئے اور انہوں نے دھیرے سے خود کلامی کی۔

''ہاں مجھے مانگنی ہی ہوگی معافی۔ آخر اتنے برسوں سے جہانگیر بھی تو مجھ سے معافیاں مانگتے رہے ہیں۔ کیا انہیں یہ زیب دیتا تھا؟ نہیں...... یقیناً نہیں۔'' انہوں نے نم آنکھیں کھول کر چند لمحے چھت کو گھورا پھر دھیرے سے اٹھ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

مجھے بھی ترکیب سکھا کوئی یار جولاہے
اکثر تجھ کو دیکھا ہے تانا بنتے
جب بھی دھاگا ٹوٹ گیا یا ختم ہوا
پھر سے باندھ کے اور سرا کوئی جوڑ کے اس میں
آگے بُننے لگتے ہو
تیرے اس تانے میں لیکن
ایک بھی گانٹھ گرہ بُنت کی
کوئی دیکھ نہیں سکتا
میں نے تو ایک بار بُنا تھا ایک ہی رشتہ
لیکن اس کی ساری گرہیں صاف نظر آتی ہیں
میرے یار جولاہے!

سیاہ جلد والی ڈائری ان کی گود میں پڑی تھی اور وہ آنکھیں موندے کرسی پر بیٹھے تھے۔

ماضی کے اوراق الٹتے۔ اسما کے التفات، وقت اور حالات کے بے رحم لمحے گنتے سود و زیاں کے حاشیوں میں درج نت نئے گوشوارے ان کے ذہن کی سلیٹ پر بن اور بگڑ رہے تھے۔

یہ سچ تھا کہ وہ اسما کے خشک اور روکھے رویّے کو زندگی بھر کا حاصل سمجھتے اسے کبھی غلط نہیں گردانتے تھے لیکن کیا یہ ان کی فراخ دلی کا ثبوت نہ تھا کہ انہوں نے کبھی اسما سے جواب طلبی نہیں کی لیکن آج ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔

''کیا اسما کو میرے اوپر اتنا بھی بھروسا نہیں...... کیا اسے لگتا ہے کہ مجھ سے رشتہ جڑنے کی پاداش میں جس طرح اس کا ذہنی سکون اور جسمانی آرام خاک ہوا مجھے اس کا احساس نہیں ہوگا اور میں ایک بار پھر وہی کہانی دُہرانے کے لیے اپنی بیٹی کو ایسے ہی ایک اور جہنم میں جھونک دوں گا۔''

کوئی دکھ جیسا دکھ تھا جو دل کی گہرائیوں سے نوحے کی صورت نکل کر رگوں میں بہہ رہا تھا۔ جس نے ان کی آنکھوں کی دہلیز کو کب سے نم کر رکھا تھا۔

اچانک...... بالکل اچانک انہیں اپنے پیروں پر کسی کے ہاتھوں کا گداز محسوس ہوا۔ بے حد چونک کر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور جھٹکے سے اپنے پیر کھینچے۔

''اسما! تم؟'' بے یقینی اور حیرت کی زیادتی سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسما ان کے قدموں میں بیٹھی تھیں۔ آنسو ان کا پورا چہرہ دھو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے آگے جوڑ دیے۔

''نہیں...... نہیں۔'' انہوں نے بے ساختہ جھک کر ان کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

دونوں میں سے کسی کو اپنے جذبات کے اظہار کے لیے زبان کی ضرورت نہ تھی۔ جہانگیر نے بے ساختہ انہیں سینے سے لگالیا۔ اسما کی آنکھوں سے بہہ نکلنے والا ڈھیروں پانی ان کے گریبان میں جذب ہوگیا۔

''میں آپ کی گناہ گار ہوں، مجھے معاف کردیں لیکن میں کیا کرتی جو زندگی بھر ملتا رہا وہی لوٹاتی رہی، میرا قصور نہ تھا...... جہانگیر۔'' وہ بے ساختہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''میں نے بھی بھلا کب تمہیں قصور وار جانا ہے۔ یہ تو دل آج زیادہ ہی دُکھا تو بے ساختہ شکوہ نکل گیا۔'' وہ پیار سے کہتے ہوئے ان کے بال سہلانے لگے۔

بدگمانی کا زرد موسم گزر چکا تھا۔ خوشیوں بھری بہار نے بہت دیر بعد اپنی بانہیں ان کے استقبال کے لیے وا کی تھیں۔ محبت اور اعتبار کے رشتے میں لگی، بدگمانی اور بے اعتنائی کی ساری گرہیں کھل چکی تھیں۔